بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

دین یا مذہب کی کسی علمبردار قوم کو بے دین اور لامذہب بنانے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کے اخلاق خصوصاً اُس کے نوجوانوں کے اخلاق کو برباد کیا جائے۔ کیونکہ اخلاق سے عاری قوم کبھی کسی دین کی خادم نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی قوم کو دین کی نعمت سے محروم کرنا مقصود ہو تو اُس کے اندر فحاشی کو فروغ دیا جاتا ہے۔ یہ سلبی طریقہ ہے۔ ایجابی طور پر یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ قوم جن معتقدات کی حامل ہے اُن کے بارے میں اُس کے دل میں مختلف شکوک و شبہات پیدا کر کے اُس کے ایمان کو غارت کیا جائے۔

اساسی تصورات کو مضمحل کرنے کی سب سے مؤثر صورت یہ ہے کہ وہ تصورات جس سرچشمۂ ہدایت سے ملے ہیں اُس کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں مختلف قسم کی بدگمانیاں پیدا کی جائیں، تاکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو جو "امرت رس" ملتا ہے اس کی کوئی امتیازی حیثیت باقی نہ رہے اور وہ اس انداز پر سوچنے لگیں کہ یہ تعلیماتِ الٰہی کا کوئی خاص سرچشمہ نہ تھا بلکہ اس کی حیثیت حکمت و دانائی کے عام چشموں کی سی تھی جس میں بہت سی دوسری آمیزشیں بھی شامل ہیں۔

دنیا کی جس قوم نے بھی مذہب سے انحراف کی راہ اختیار کی اُس کی پہلی منزل یہی تھی کہ اُس نے سب سے پہلے اُس ذات کے بارے میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں پیدا کیں جس کی وساطت سے اللہ تعالیٰ نے اپنا منشا اُس پر واضح کیا تھا۔ اس واسطہ کے درمیان سے ہٹ جانے کے بعد راستہ بڑا آسان ہو جاتا ہے اور لوگوں کو بڑے معصومانہ انداز میں یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ کتابِ الٰہی پر غور کرنے اور اس کے مطالب اخذ کرنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ یہ بات بظاہر بڑی معقول نظر آتی ہے۔ لیکن وقت کے غالب رجحانات سے مرعوب انسان

تعلیماتِ الٰہی میں غور و فکر کرنے اور حکمت کے نئے نئے پہلو نکالنے کی آڑ میں دین کے اندر ایسی تاویلات کرنے لگتے ہیں جن سے اُس کا بالکل حلیہ بگڑ کر رہ جاتا ہے ۔

دَورِ جدید میں مسیحیت کا جو حشر ہوا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ یہاں چونکہ اُس مقدس ذات کی وہ تصریحات محفوظ نہ تھیں جن سے تعلیماتِ الٰہی کا صحیح منشا متعین ہوتا تھا، اس لیے من مانی تاویلات کا کام بالکل آسان ہو گیا۔ مسیحی پادری جو بائبل کے شارح اور ترجمان تھے۔ اُن کی مُوشگافیوں سے عوام پہلے ہی تنگ آئے ہوئے تھے، اس لیے جب اُن کے سامنے یہ دعوت پیش کی گئی کہ آؤ خود کتابِ مقدس پر غور کر کے نتائج اخذ کرو تو انہوں نے اس پر بڑے والہانہ انداز میں لبّیک کہا اور پھر سرمایہ دارانہ نظام کے سارے تقاضوں کے پیشِ نظر اُس میں ایسی تحریفات کیں کہ مذہب کی کوئی امتیازی حیثیت باقی نہ رہی اور وہ اُمورِ دنیا کے تابع ہو کر رہ گیا۔

اسلام میں اُس مقدس ذات کی تصریحات اور اُس کی حیاتِ طیّبہ کا ہر پہلو پُوری طرح محفوظ ہے جس کی وساطت سے ہمیں قرآن مجید ملا ہے اور جس کے ذریعہ سے ہمیں دین کی تعلیم دی گئی ہے۔ اُس کا کام صرف اللہ کا پیغام ہم تک پہنچانا نہ تھا بلکہ اُس کے پیغام کو اُس کے منشا اور مرضی کے مطابق زندگی میں نافذ کر کے اُس کے عملی مضمرات کو بھی واضح کرنا تھا، اور اس سلسلہ میں جو اسوۂ حسنہ اس نے چھوڑا وہ بھی محفوظ ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو جو کوئی دین سے برگشتہ کرنا چاہے اس کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ سب سے پہلے اس واسطے کی حیثیت کے بارے میں مختلف بدگمانیاں پھیلائے جو قرآن مجید پہنچانے کا ذریعہ ہے ۔

حضور سرورِ عالمؐ ایک تاریخ ساز شخصیت تھے ۔ وہ حکمت و دانائی کے منبع تھے۔ انہوں نے لوگوں کی زندگیوں میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا۔ ظاہر بات ہے کہ ان حقائق کا تو کوئی شخص انکار بھی نہیں کر سکتا۔ مگر یہ چیزیں اسلام کے اساسی تصوّرات نہیں ہیں۔ یہاں اصل مسئلہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کیا جائے کہ حضور سرورِ دو عالمؐ نے اپنی ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں جو کچھ ارشاد فرمایا، یا جو کچھ کیا، اُس کی حیثیت کیا ہے۔ قرآن مجید اور حضورؐ کے اپنے ارشادات اس بات کی پوری وضاحت کرتے ہیں کہ حضورؐ

نے تعلیم و تلقین، اور تربیت و اصلاح کا جو کچھ بھی کام کیا، اور اس سلسلے میں جو کچھ بھی فرمایا وہ بحیثیت نبی کے تھا اس لیے وہ بھی دین میں حجت ہے اور آپؐ نے قرآن مجید کی تعلیمات کا جو مفہوم متعین فرمایا، وہی خدا کے نزدیک معتبر ہے۔ اس کے مقابلے میں جو موشگافیاں بھی کی جائیں وہ سب غلط اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو چونکہ قرآن مجید اور اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت تک کے لیے محفوظ رکھنا مقصود تھا اس لیے اس نے تحریف کے ہر دروازے کو بند کر دیا۔ لفظی تحریف سے بچانے کے لیے اس نے مسلمانوں کو حفظِ قرآن کی تلقین کی۔ اور معنوی تحریف سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے سنتِ نبویؐ کو زندہ رکھنے کا انتظام فرمایا۔

ہمارے عہد کے مستشرقین اور اُن کی پیروی میں مسلمانوں کے مغرب زدہ طبقے نے جب اسلام کے خلاف مہم شروع کی تو انہوں نے اس حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر منصوبہ بنایا اور اس امر کی کوشش کی کہ سب سے پہلے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حیثیت کو ختم کیا جائے کہ حضورؐ کے اقوال و اعمال اور حضورؐ کی تصریحات دین میں حجت ہیں اور ان کے مقابلے میں کسی دوسرے کا قول یا حکم قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ انہیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ جب تک مسلمان سنتِ نبوی کو اپنے لیے حجت سمجھتے رہیں گے اُس وقت تک کلام الٰہی میں معنوی تحریف کی کوئی کوشش کبھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ اب ان کے کام کا انداز یہ ہے کہ ایک طرف حضورؐ کی تعریف کی جاتی ہے، انہیں ایک بڑا کامیاب مصلح بیان کیا جاتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ حضورؐ کے ارشادات اور آپ کے اعمال اپنے دور کے لیے تو حجت تھے مگر ہر دور کے لیے انہیں دین کی اساس قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ انہوں نے قرآن پاک کو لوگوں تک پہنچانے کے علاوہ جو کچھ کیا یا جو کچھ فرمایا وہ بحیثیت حکمراں یا رہنما کے تھا۔ اس لیے اُن کے اپنے دور کے لوگوں کے لیے تو وہ آخری سند کی حیثیت رکھتا تھا، مگر ہمارے لیے اُس کی یہ حیثیت نہیں ہو سکتی۔ پھر اس گمراہ کن نظریے کو پھیلانے کے لیے عجیب و غریب استدلال کیا جاتا ہے۔ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ احادیث کی صحت محلِ نظر ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی جاتی ہے کہ حضورؐ نے قرآن مجید کے علاوہ جو کچھ فرمایا اس کا سرچشمہ وحی نہیں بلکہ اُن کا

اپنا شعور اور ادراک ہے، اس لیے وہ ہر دور کے لیے فرمانِ الٰہی کی طرح حجت نہیں ہو سکتا۔ ہر عہد کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ان کے مطابق ہمیں کلامِ الٰہی کا مفہوم متعین کرنا چاہیے۔

فتنۂ انکارِ حدیث استدلال کی ان دو غلط بنیادوں پر کھڑا ہے۔ اس فتنے کے اثرات کا ہمیں شروع ہی سے اندازہ تھا کہ کس قسم کے لوگ اس سے متاثر ہوں گے۔ اس سے سب سے زیادہ متاثر وہ مغرب زدہ افراد ہیں جو یورپین تہذیب سے ذہنی طور پر شدید مرعوب ہیں اور اُن کی عملی زندگی میں یہ تہذیب پوری طرح رچ بس چکی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں مسندِ اقتدار بھی حاصل ہے۔ اسلام اُن کے نزدیک ایک ایسا دلفریب نعرہ ہے جس کے ذریعہ عوام کے جذبات کے ساتھ بڑی آسانی سے کھیلا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ کُھلم کھلا دینِ برحق سے انحراف کا اعلان نہیں کر سکتے۔ مگر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اُن میں نہ اُمنگ ہے نہ ہمت۔ وہ صرف اس لفظ کو استعمال کر کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ بیوقوف بنانا چاہتے ہیں۔ اس ناپاک مقصد کے حصول کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اسلام کی جو صورت ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی ہے اُسے وقتی صورت قرار دے کر لوگوں کے اندر یہ گمراہی پھیلائی جائے کہ دینِ حق ایک ایسا سیال مادہ ہے جو ہر سانچے میں بڑی آسانی کے ساتھ ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس نظریہ کو تقویت پہنچانے کے لیے بعض نہایت گمراہ کُن تصورات گھڑے گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک تصور یہ ہے کہ اسلام کے ایک دو نظریات، یعنی توحیدِ باری تعالیٰ اور مساواتِ انسانی تو ابدی حیثیت کے حامل ہیں اور باقی سب باتیں وقتی اور ہنگامی ہیں۔ اس قسم کی خرافات وقتاً فوقتاً منظرِ عام پر آتی رہتی تھیں۔ لیکن اب حال ہی میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن، حکومتِ پاکستان کے ادارۂ تحقیقِ اسلامی کے ڈائریکٹر کی تصنیف "اسلام" نے اُس ذہنیت کی ترجمانی کی ہے جو ان کے پیچھے کام کر رہی ہے۔ یہ کتاب انگلستان میں بڑے اُونچے طباعتی معیار کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور ملک کے اندر اور باہر پھیلائی جا رہی ہے۔ ہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ماضی تو کیا دورِ حاضر میں بھی کسی مسلمان نے وہ باتیں کہنے کی جسارت نہیں کی تھی جو ڈاکٹر صاحب نے لکھی ہیں۔ اگر کتاب پر سے فضل الرحمٰن صاحب کا اسمِ گرامی ہٹا دیا جائے اور پھر اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوئی اسلام دشمن مسیحی پادری، یا یہودی مستشرق نے طرزِ استدلال کے ساتھ اسلامی

معتقدات کی بیخ کنی کر رہا ہے۔

یوں تو یہ ساری کتاب ہی گمراہ کن افکار کا پلندہ ہے، لیکن اس کے ابتدائی ابواب، جن کا تعلق ایمان اور اعتقادات سے ہے، وہ تو انتہائی شرمناک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان میں وحی، الہام، مقام رسالت، قرآن مجید، سب کے بارے میں عجیب و غریب نظریات پیش کیے ہیں۔ لیکن انہوں نے ان سب میں یہ ہنرمندی اور چابکدستی دکھائی ہے کہ انہیں ایک ایسی مغلق فلسفیانہ زبان میں بیان کیا ہے جسے عوام سمجھ نہ سکیں اور جب کسی طرف سے گرفت کی جائے تو یہ کہہ کر اُس کی تردید کی جا سکے کہ اُن کے موقف کو سمجھنے میں غلطی کی گئی ہے۔

کتاب کے مندرجات کے بارے میں کوئی گزارش پیش کرنے سے پہلے چند چیزیں ذہن نشین رہنی چاہییں۔ کتاب میں آغاز سے لے کر آخر تک انہوں نے ORTHODOXY (جس کا صحیح ترجمہ راسخ العقیدگی ہے نہ کہ رجعت پسندی جیسا کہ بالعموم لوگ کرتے ہیں) کی خوب تذلیل کی ہے۔ جس جس مقام پر وہ اپنے گمراہ کن نظریات کو اصل اسلامی تصورات سے متصادم پاتے ہیں، وہاں اسلامی تصورات کو آرتھوڈوکسی کے نام سے یاد کر کے اس کا خوب مذاق اڑاتے ہیں اور اس کی قطعاً پروا نہیں کرتے کہ اس کی زد کہاں کہاں پڑ رہی ہے۔ اس معاملے میں انہوں نے کسی معقولیت کا ثبوت نہیں دیا۔ ان میں ایمانداری کے ساتھ کھل کر یہ بات صاف صاف کہنے کی ہمت نہ تھی کہ وہ اسلام غلط ہے جو قرآن و سنت اور امتِ مسلمہ کے اجماع سے ثابت ہے، بلکہ اصل اسلام وہ ہے جسے میں اب تصنیف کر رہا ہوں۔ اس کے بجائے انہوں نے ایک اخلاقی بزدل اور علمی جعل ساز کی طرح اصل اسلام کو آرتھوڈوکسی کا نام دیا ہے، اور اس کا مذاق اڑا کر ناواقف لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اصل اسلام تو جعلی ہے، اور ان کا اسلام اصلی ہے۔

دوسرے انہوں نے یہ کتاب اس انداز سے لکھی ہے کہ کوئی مسلمان نہیں بلکہ کوئی ہمدرد غیر مسلم ثالث بالخیر بن کر اسلامی اعتقادات کا محاسبہ کر رہا ہے اور جہاں جہاں وہ اسلامی تعلیمات کو مغربی نظریات سے مختلف پاتا ہے وہ یہ کہہ کر اسلام کی حمایت کرتا ہے کہ اصل دین سے اِن تعلیمات کا کوئی تعلق نہیں، یہ تو آرتھوڈوکس

لوگوں کی من مانی تاویلات ہیں جنہیں عوام نے غلطی سے دین میں شامل کر لیا ہے۔ ورنہ اسلام کی اصل تعلیمات کا مغربی نظریات و تصورات سے کوئی تصادم نہیں ہے۔

کتاب کا سارا طرزِ استدلال چونکہ ایک فلسفیانہ مسئلہ کے گرد گھومتا ہے، اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے اُسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے تاکہ باقی مباحث سمجھنے میں آسانی ہو۔ فلسفۂ مذہب میں یہ سوال بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ کیا وحی کسی خارجی پیغام کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو بھیجتا ہے، یا یہ نبی کی اپنی کوئی داخلی کیفیت ہے جو غیر معمولی حالت میں اس پر طاری ہو جاتی ہے اور اُس کی زبان سے حکمت و دانائی کے بیش قیمت موتی جھڑنے لگتے ہیں۔

اس مسئلے میں صحیح صورتِ واقعہ یہ ہے کہ وحی پیغمبر کی کسی داخلی کیفیت کا نام نہیں بلکہ یہ خارج سے آنے والی چیز ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اس کا امانت دار فرشتہ بڑی حفاظت کے ساتھ اس کے اُوپر نازل کرتا ہے۔ مذہب کے مسلم اور غیر مسلم حکماء نے اس موضوع پر بڑی فکر انگیز بحثیں کی ہیں اور اُن لوگوں کے دلائل کو باطل قرار دیا ہے جو الہامی پیغام کو پیغمبر کی اپنی ایک داخلی کیفیت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ نے النبوات میں بڑی صراحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ وحی کسی ارفع ذہانت (HIGHER INTELLECT) یا کسی گہرے داخلی احساس کی طرز کی کوئی چیز نہیں، کیونکہ اگر یہ بات ہو تو وہ کبھی منزہ عن الخطا نہیں ہو سکتی۔ جو چیز کسی فرد کی اعلیٰ فکری کاوش یا ذاتی احساس کا نتیجہ ہو اُس پر اُس فرد کی شخصیت کی پرچھائیں ضرور پڑتی ہے۔ اور اُس کے نتائج میں اُس کے ذاتی رُجحانات لازمی طور پر شامل ہوتے ہیں۔ مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوبات میں اس موضوع پر مختلف انداز سے اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ نبی کی تعلیمات اسی وجہ سے دین میں حجت ہیں کہ وہ ہر خطا سے پاک اور ہر عیب سے منزہ ہوتی ہیں، کیونکہ ان میں کسی شخص کے ذاتی احساسات اور کیفیات کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ جس چیز کو کسوٹی یا الفرقان قرار دیا جا رہا ہو وہ اگر بے لاگ نہ ہو تو صحیح معیار کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ وحی کے مقابلے میں داخلی کیفیات کی مثالیں ہمیں شاعری اور صوفیانہ جذب و حال میں ملتی ہیں۔ قرآن مجید میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بار بار جو اس بات کی

تصریح کی گئی ہے کہ وہ شاعر نہیں ہیں اُس کی وجہ دوسری مختلف قسم کی غلط فہمیوں کو دُور کرنے کے علاوہ ایک یہ بھی ہے کہ لوگ پیغمبر کی وحی کو شاعری کی نوعیت کا کوئی داخلی تاثر یا تخیل کی بلند پروازی نہ سمجھ بیٹھیں۔

ہمارے اس دَور میں جب حدیث کے خلاف ایک فتنہ اٹھا تو اس مسئلہ کو بھی پوری شدّت کے ساتھ اٹھایا گیا، اور بظاہر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی رفعت اور عظمت ثابت کرنے کے لیے یہ کہا گیا کہ جب آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وحی ایک خارجی چیز ہے تو اس کا مطلب معاذ اللہ یہ ہے کہ "آپ پیغمبر علیہ السلام کو محض شیشے کی ایک امتحانی نالی سمجھتے ہیں جس کے ایک طرف اللہ نے پھونک ماری اور دوسری طرف انہوں نے اُسے نکال دیا" چند ماہ ہوئے حیدر آباد دکن کے ایک صاحب نے اس موضوع پر انگریزی میں ایک طویل مقالہ تحریر کیا تھا جس میں بعینہٖ یہی تشبیہ دی گئی تھی۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا بھی طرزِ استدلال یہی ہے اور یہی ان کے فکر کا نقطۂ آغاز ہے۔ وہ بظاہر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے مدح خواں بنتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آخر یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ حضورؐ کے ذاتی احساسات اور افکار کو ان کی زندگی میں کوئی دخل نہ ہو اور انہوں نے جو پیغام ہمیں دیا ہے اُس میں ان کا اپنا کوئی حصّہ نہ ہو۔ یہ بات ظاہری طور پر بڑی معقول معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ وہ خوفناک دھوکا ہے جو یہ لوگ اُمتِ مُسلمہ کو دے رہے ہیں۔ اگر وحی و الہام شاعری اور صوفیانہ جذب کی طرح ایک داخلی چیز ہے تو پھر ایک پیغمبر، شاعر اور صوفی میں کیا فرق ہے؟ اور اُس کی وہ کونسی امتیازی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اُس کے ارشادات کو دین میں حجّت اور اُس کی حیاتِ طیبہ کو اُسوۂ حسنہ بنایا گیا ہے؟

یہ لوگ یا تو وحی کی نوعیت کو سمجھ نہیں سکے یا اُس کو بے وزن بنانے کے لیے جان بوجھ کر ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ وحی کو اللہ تعالیٰ پوری حفاظت کے ساتھ پیغمبر علیہ السلام پر نازل فرماتا ہے۔ وہ ذات مقدس اس کی امین بنتی ہے اور اُسے نوعِ بشری تک پہنچاتی ہے۔ اللہ کا یہ نور نبی کے قلب و دماغ کو منور کرتا ہے اور وہ اس روشنی میں پیغامِ الٰہی کے مضمرات انسانوں کو سمجھاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ باری تعالیٰ نبی کی خود حفاظت اور رہنمائی کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اُس کا منشا ٹھیک ٹھیک واضح کیا جائے۔

کیا یہ امتحانی نالی کی کیفیت ہے ؟ آخر اس میں کونسی بات عقل کے خلاف ہے ؟

اب دیکھیے کہ ڈاکٹر صاحب وحی و الہام کو کیا سمجھتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ الہام کے ساتھ فرشتے کی آمد کا تصور یہ ذہنی ناپختگی کی علامت ہے (ص ۱۴۱) اور یہ عقیدہ اسلام میں عقلیت پسندوں کو خاموش کرنے اور وحی و الہام کی معروضیت[1] (OBJECTIVITY) ثابت کرنے کے لیے گھڑا گیا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ سب رجعت پسندوں کی موشگافیاں ہیں۔ حضور سرورِ دو عالم پر نزولِ وحی کے وقت جو کیفیت طاری ہوتی تھی، جس سے وحی کی معروضی حیثیت ثابت ہوتی ہے، ڈاکٹر صاحب اس کی تردید کرتے ہیں اور حضورؐ کی اُن کیفیات کو اس طریقے سے بیان کرتے ہیں جس سے کسی نہ کسی طرح یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ وحی دراصل حضورؐ کے ذاتی اور داخلی تاثرات تھے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب کے اپنے ارشادات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ وہ سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی وحی کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ داخلی نوعیت کی کوئی چیز تھی۔ وہ بڑی چالاکی کے ساتھ حضورؐ کی اخلاقی حس کو بنیاد بنا کر یہ کہتے ہیں کہ وہ اسی ذہنی اضطراب کی وجہ سے غارِ حرا کی تنہائیوں میں بیٹھ کر غور و فکر کیا کرتے تھے اور غور و فکر کا یہی انداز بالآخر وحی پر منتج ہوا۔ یہ بات جن الفاظ میں انہوں نے بیان کی ہے وہ یہ ہیں :

> "ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اخلاقی احساس وقتاً فوقتاً انہیں غارِ حرا کی تنہائیوں میں لے جاتا تھا جہاں وہ مکہ سے باہر بہت دیر تک گیان دھیان میں معروف رہتے تھے۔
> اس مذہبی اخلاقی تجربے کے داخلی عمل نے گہرے سوچ بچار کی ان کیفیات کو ایک مرتبہ وحی کے مقام

---

[1] چونکہ معروضیت اور داخلیت (SUBJECTIVITY) کی اصطلاحات بار بار آئیں گی اس لیے ان کی وضاحت ضروری ہے۔ جس اصول، ضابطے یا قدر میں انسان کی اپنی داخلی کیفیات شامل نہ ہوں، بلکہ وہ اس کی ذات سے باہر کسی منبع و ماخذ سے اس کے پاس آئے اسے معروضی کہتے ہیں۔ اور جس میں انسان کی اپنی سوچ اور اُس کے ذاتی احساسات اور فکر و مراقبہ یا واردات کا دخل ہو وہ داخلیت کے زمرے میں آتا ہے۔ دینی نقطۂ نظر سے وحی معروضی چیز ہے اور شاعری داخلیت کے تحت آتی ہے۔ صوفیانہ واردات بھی اسی نوعیت کی چیز ہے۔

تک پہنچا دیا۔" ص۱۱

جو بات مستشرقین آج کل عام طور پر وحی کے بارے میں کہتے ہیں وہی بات ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وحی اُس اضطراب کا نتیجہ تھی جو حضورؐ کے دل و دماغ میں اپنی قوم کی اخلاقی پستی دیکھ کر پیدا ہو رہا تھا اور جو آپ کو غار حرا کی گوشہ نشینی پر مجبور کرتا تھا تو سب سے پہلی وحی میں کسی اعتقادی یا اخلاقی پستی کی طرف اشارہ ہوتا۔ وہاں تو ہمیں اس کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔ پہلی وحی کے الفاظ میں کسی قسم کا کوئی جوش، ولولہ یا اضطراب نہیں بلکہ ایک سیدھا سادہ مطالبہ اور ایک معروف حقیقت کا اظہار ہے:

"پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا تخلیق کرنے والا ہے، جس نے انسان کو جمے ہوئے لہو سے بنایا۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم سے۔" (علق)

اس پہلی وحی کے الفاظ پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ یہاں کس اضطراب یا ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں کس اخلاقی مذہبی تجربے کے داخلی عمل کا اظہار ہو رہا ہے؟ ایک معروف حقیقت بڑے غیر جذباتی انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگاروں سے یہ گلہ ہے کہ انہوں نے حضورؐ کی زندگی کے خارجی واقعات کو تو بڑی تفصیل سے قلمبند کیا ہے مگر اُن کی داخلی واردات اور کیفیات سے قطعاً بحث نہیں کی۔ ص۱۶

ڈاکٹر صاحب کی یہ شکایت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ وحی والہام کو انسان کی داخلی کیفیت کی کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی کتاب اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید کے آخری باب میں اس کی بڑی معقول وجہ بیان کی ہے۔ کسی فرد کا نفسیاتی تجزیہ اسی بنا پر کیا جاتا ہے کہ بہت سے دوسرے افراد، جن میں یہ تجزیہ کرنے والے بھی شامل ہوتے ہیں، مشترک قلبی واردات کی وجہ سے اُن کی ماہیت کو سمجھ سکتے ہیں لیکن اگر کسی شخص کی یہ واردات بالکل مختلف نوعیت کی ہوں اور عام انسان اُن سے قطعاً نا آشنا ہوں تو پھر انہیں کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ نبی کی واردات اور اُس کے ذہنی تجربات عام نوعیت کے نہیں ہوتے جن سے نوعِ بشری لذت آشنا ہو سکے۔ ان تجربات سے صرف معدودے چند افراد ہی گزرتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اب چونکہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اس لیے آئندہ کے لیے بھی اس بات کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ ہم نبوت

کے داخلی تجربات سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ اور اگر کوشش بھی کریں تو کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ نہ سکیں گے۔

ہمارے اسلاف نے اس صورتِ حال کو اچھی طرح جان لیا تھا اس لیے انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نفسیاتی تجزیہ کرنے یا قلبی واردات معلوم کرنے کے بجائے اُن ارشادات و اعمال اور اُن حیات آفریں اثرات کو قلمبند کیا جنہوں نے نوعِ بشری میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اُمتِ مُسلمہ کے حکماء نے نبوّت کی داخلی کیفیات کے بجائے جو اُن کے فہم و ادراک سے باہر تھیں، اُن کے خارجی مظاہر اور اثرات کو سمجھنے کی کوشش کی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ کے وہ واقعات جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وحی واردات قلبی کا نام نہیں بلکہ خارجی چیز ہے، اُسے ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب رجعت پسندوں کی اختراع سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ وحی کے وقت حضورؐ کے سامنے جبریلِ امینؑ کا نمودار ہونا، یا معراج جسمانی کی باتیں بعد میں گھڑی گئی ہیں۔ اُن کے نزدیک ان کی حیثیت "تاریخی افسانے سے زیادہ نہیں" (ص ۱۴)

ڈاکٹر صاحب کے اس بے بنیاد قول سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کے نزدیک احادیثِ نبوّی کی کیا حیثیت ہے۔ وحی کے وقت فرشتے کے نمودار ہونے اور حضورؐ کے معراجِ جسمانی کے واقعات احادیث کی ساری معتبر اور مستند کتب میں ملتے ہیں۔ صحیح بخاری اور مُسلم میں ان کی تفصیلات پوری طرح درج ہیں۔ ان کی شہادتوں کو ڈاکٹر صاحب کی قسم کے آدمی ہی تاریخی افسانے کہنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔

وحی و الہام کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے جو تصور پیش کیا ہے وہ ان کی پوری تصنیف میں نمایاں ہے۔ ان کے تصور کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شاعر کسی وقتی تاثر کے تحت اپنے واردات قلبی کو اشعار میں ڈھال دیتا ہے، بالکل اسی طرح نبی اپنے عہد کے مسائل پر مضطرب اور پریشان ہوتا ہے اور ان کے بارے میں سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے، اور یہ داخلی عمل ایک دن وحی و الہام پر منتج ہو جاتا ہے۔

احادیث کے متعلق تو ڈاکٹر صاحب کے نظریات سامنے آ ہی چکے ہیں۔ قرآن مجید کے متعلق بھی انہوں نے ایک ایسی بات کی ہے جو یکسر باطل اور بے بنیاد ہے۔ اپنے اس گمراہ کن نظریہ کے لیے بھی انہوں نے بالکل ایک

غلط بنیاد قائم کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے موقف کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے پہلے اس بنیاد کا سمجھنا ضروری ہے۔ آپ نے مغرب زدہ مسلمانوں کے قلم یا زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اکثر سنے ہوں گے کہ اسلام چند ابدی حقیقتوں کا نام ہے۔ یہ بات بظاہر بڑی دلفریب ہے لیکن یہ وہ اصل بنیاد ہے جس پر یہ لوگ گمراہی کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ یہ بنیادی حقیقتیں ہیں کیا؟ کائنات کے مطالعے سے انسان نے بعض ایسے نتائج اخذ کیے ہیں جو اُس کی فطرت سے قریب ہیں اور جنہیں وہ اخلاقی اصول کہتا ہے۔ مثلاً کائنات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو بھی ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیے۔ کائنات وسیع ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کی ترقی کا راز وسیع النظری میں مضمر ہے۔ کائنات کے مشاہدے سے اس دنیا میں چند ایسے تصورات متعارف اور معروف حقائق کی صورت میں موجود ہیں جن کی صحت کو ہر فرد شعوری یا غیر شعوری طور پر تسلیم کرتا ہے۔ ان کی فہرست طویل نہیں، انصاف، مساوات، احترامِ انسانیت، ایمانداری، بیدار مغزی الغرض اسی نوعیت کے چند ایسے اصول ہیں جو ہر عہد میں نوعِ بشری کا بیش قیمت سرمایہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی ان حقائق کو اپنی بحث کی بنیاد بنایا ہے لیکن انہوں نے اُن کا نام "اخلاقی قوانین (MORAL LAWS) رکھا ہے۔

ان اصولوں میں بلاشبہ مذہب ایک عنصر کے طور پر شامل ہے، لیکن مجرد یہ تصورات جس طرح کہ آج دنیا میں موجود ہیں کسی قوم کو مذہب کا علمبردار نہیں بنا سکتے۔ ان کے معانی اور مفہوم بالکل بدل گئے ہیں۔ مثلاً مجرد انصاف اپنے اندر کوئی معنویت نہیں رکھتا۔ جس نظریۂ حیات کے تحت اسے استعمال کیا جائے وہی اس کے منشا کو متعین کریگا۔ اس کی ایک مثال سے وضاحت کی جاتی ہے۔ احترامِ انسانیت محض ایک نظریہ ہے جس سے ہر قوم اپنے اساسی تصورات کے تحت خاص مفہوم اخذ کرتی ہے۔ ایک فاشسٹ کے نزدیک احترامِ انسانیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک خاص طبقے کا احترام کیا جائے۔ کمیونسٹ کی نظر میں احترامِ انسانیت سے مراد محنت کش طبقے کا احترام ہے اور قوم پرست اس سے مراد یہ لیتا ہے کہ اُس کی قوم کا پوری نوعِ بشری احترام کرے کیونکہ ساری انسانیت

اُس کی قوم کے اندر سمٹ کر رہ گئی ہے۔

اسی طرح آپ یہ دیکھیے کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ظلم بُری چیز ہے۔ یہ ایک دلکش نظریہ، یا دوسرے لفظوں میں ایک اخلاقی اصول یا ابدی حقیقت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آخر یہ کس طرح فیصلہ کیا جائے کہ کونسا فعل ظلم کے دائرے میں آتا ہے؟ اگر سرمایہ دار کسی مزدور کی تدید زائد ہتھیالے تو یہ ظلم ہے۔ لیکن اگر اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لیے کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تو یہ ظلم و استبداد نہیں بلکہ یہ ایک عظیم خدمت ہے اور یہ گناہوں پر مظالم کے پہاڑ توڑنے والے ستائش کے مستحق ہیں۔ اگر کوئی شخص دھوکے یا فریب سے کسی دوسرے شخص کو اُس کی کسی چیز سے محروم کردے تو یہ جرم ہے لیکن اگر کوئی عیار فرد یا قوم سازش کے ذریعہ کسی قوم کی متاعِ آزادی چھین لے اور زبردستی اُس کی گردن پر مسلط ہو جاتے اور اُس کی زندگی کو عذاب بنا دے تو یہ قومی خدمت ہے۔

میری ان گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ اخلاقی قوانین اور یہ چند ابدی حقائق جن کی آڑ میں اسلام کا حلیہ بگاڑا جا رہا ہے، شریعت کے بغیر اپنے اندر کوئی معنویت نہیں رکھتے۔ شریعت ہی کے ذریعہ ان کا مفہوم متعین ہوتا ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام نے معتقدات کے ساتھ جو نظامِ شریعت پیش کیا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان تصورات کے اندر معنویت پیدا ہو اور لوگ ان کا واضح منشا اور مفہوم سمجھیں۔ ڈاکٹر صاحب نظامِ شریعت کو تو وقتی چیز سمجھتے ہیں اور ان اضافی تصورات کو اسلام ثابت کرنے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ اس سے اُن کا مدعا یہ ہے کہ جب اسلام کے بارے میں ایک مرتبہ یہ طے ہو گیا کہ یہ چند بے رنگ حقائق کا نام ہے جن کے اندر حالات کے مطابق رنگ بھرا جا سکتا ہے تو پھر دین کے اندر وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی بالکل آسان ہو گی بلکہ دین خود بخود بغیر کسی مزاحمت کے حالات کے سانچوں میں ڈھلتا چلا جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ اخلاقی قانون ہی مذہب کی اصل بنیاد اور اساس ہے۔ اُن کے نزدیک قرآن مجید

کے وہ ارشادات جو ان ابدی حقائق سے ہم آہنگ ہیں وہ مستقل قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ باقی رہے وہ معاملات جو حالات کی تبدیلی کی وجہ سے ان سے ہم آہنگ نہ ہو سکیں تو اُن کی نوعیت ابدی نہیں۔ اُن کے اندر وقت کے تقاضوں کے مطابق ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے اس موقف کے بارے میں بعد میں اظہارِ خیال کروں گا لیکن اس سے پہلے میں اُن کے اِس نقطۂ نظر کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے قرآن مجید کے بارے میں پیش کیا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے غور و فکر اور وحی سے اُس کے تعلق کے بارے میں تو گذشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید کے متعلق بھی ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا ہے۔ اُن کے نزدیک قرآن مجید کی ماہیت یہ ہے کہ حضور غور و فکر کرتے کرتے اس مقام پر جا پہنچے جہاں انہیں ایسے حقائق کا ادراک ہونے لگا جو اخلاقی قوانین سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ یہی حقائق درحقیقت "کتابِ مبین" میں ہمارے سامنے ہیں، یعنی کلامِ الٰہی بنیادی طور پر حضورؐ کے غور و فکر کا نتیجہ ہے، لیکن یہ اُس اعلیٰ معیار کا غور و فکر ہے جب حضور سرمدِ کائنات کی سوچی ہوئی حقیقتیں اخلاقی قوانین سے مطابقت پیدا کرنے لگیں۔

ڈاکٹر صاحب کی اس تصریح کو ذرا اُن کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

"وقوفی ادراک (COGNITIVE PERCEPTION) کے معاملے میں انسانوں کے مابین بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اخلاقی اور مذہبی ادراک مجرد عقل سے بھی بہت زیادہ مختلف ہوتا ہے کیونکہ اوّل الذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ادراک کے ساتھ مُدرِک میں شدت کا احساس اور اُس کے اندر نمایاں طور پر انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ادراک اور اخلاقی احساس کے مختلف مدارج ہیں۔ یہ اختلاف صرف افراد کے مابین ہی پایا نہیں جاتا بلکہ فرد کی داخلی زندگی میں اس نقطۂ نظر سے تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ہم یہاں اصل اخلاقی اور ذہنی نشوونما اور ارتقاء کا ذکر نہیں کر رہے جس میں تغیر و تبدل بڑا نمایاں ہوتا ہے مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اچھے بالغ شخص میں بھی جس کی اوسط ذہنی سطح اور اخلاق اور استعداد ایک اعتبار سے متعین ہوتی ہے، یہ تغیرات پائے جاتے ہیں۔ اب پیغمبر ایک ایسا انسان ہے جس کی بحیثیت مجموعی سیرت اور کردار عام انسانیت سے بہت زیادہ بلند ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو انسانوں اور اپنے بہت

سے مقاصد کے بارے میں غیر معمولی طور پر مضطرب رہتا ہے اور تاریخ سازی کا آرزومند ہوتا ہے مسلمانوں کے راسخ العقیدہ افراد نے اس بنا پر بیہ بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا کہ انبیاء علیہم السلام کو کبائر سے بالکل محفوظ اور مامون ہونا چاہیے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)[1] بھی اس طرح کی ایک شخصیت تھے۔ درحقیقت وہی تاریخ میں اس نوعیت کی واحد ذات ہیں۔ اسی بنا پر اُن کے طرزِ عمل کو مسلمان سنت یا اسوۂ حسنہ سمجھتے ہیں۔ لیکن حضوؐر کی زندگی میں بعض ایسے لمحات بھی آتے جب وہ اپنی ذات سے ماورا ہو جاتے اور

اُن کا اخلاقی و قوفی ادراک (MORAL COGNITIVE PERCEPTION) اتنا شدید اور تیز ہو جاتا کہ اُن کا شعور اخلاقی قانون سے بالکل مطابقت اختیار کر لیتا" اور اس طرح ہم نے تمہارے اندر اپنے حکم کی رُوح پھونکی۔ آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے[2] اور ہم نے اس (قرآن کو) نور بنا دیا ہے (الشوریٰ -۵۲) ص ۳۲

خط کشیدہ عبارت کو، جو ڈاکٹر صاحب کے قرآن مجید کے متعلق اس تصوّر کا خلاصہ ہے، غور سے پڑھیے اور دیکھیے کہ اس کے متعلق کیا رائے دی جا رہی ہے یعنی یہ حضوؐر کے اُس گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے جب آپ اُن حقائق کا ادراک کرنے لگیں جو اخلاقی اصوّل سے ہم آہنگ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اِنہیں معنوں میں اسے ایک الہامی اور آسمانی کتاب سمجھتے ہیں۔ اپنے اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"قرآن مجید الہامی کلام ہے لیکن اس کا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی داخلی شخصیت سے بھی نہایت گہرا تعلق ہے اس تعلق کو ہم دگراموفون) ریکارڈ کی طرح ایک میکانکی تعلق نہیں سمجھ سکتے۔ کلام الٰہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب سے رواں ہوا۔ (ص ۳۳)

ڈاکٹر صاحب کی ان تصریحات سے یہ بات پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اُن کے نزدیک اصل اہمیت ان کے مزعومہ اخلاقی قانون کی ہے۔ قرآن مجید بھی اگر کسی التفات کا مستحق ہے تو وہ صرف اس بنا پر کہ اس

---

[1] مصنف نے آنحضوؐر کے اسم گرامی کے ساتھ کسی جگہ صلوٰۃ و سلام کا اضافہ نہیں کیا۔

[2] کتاب کیا چیز ہے کے ساتھ قرآن میں یہ بھی آتا ہے" اور نہ یہ کہ ایمان کیا چیز ہے"

میں حضور سرورِ کائنات نے چند خوش نصیب لمحات میں جن حقائق کا ادراک کیا وہ بخت و اتفاق سے اس اخلاقی قانون سے ہم آہنگ ہو گئے۔

یہ ہے وہ فلسفہ جس کے ذریعہ قرآن مجید کی الہامی حیثیت ختم کر کے بنیادی اہمیت اخلاقی اصول کو دی جا رہی ہے۔ آپ خود غور کریں کہ جب اصل معیار قرآن مجید نہیں بلکہ اخلاقی اصول ہے اور کلام پاک کی بھی اہمیت ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ اس میں بیان کردہ حقائق اخلاقی قوانین سے ہم آہنگ ہیں تو پھر کوئی سرپھرا ہی ہو گا کہ وہ اصل معیار کو چھوڑ کر قرآن مجید کی طرف رجوع کرے۔

معاملہ پھر یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب پورے قرآن مجید کو بھی ابدی حقائق کا مجموعہ نہیں سمجھتے کہ انسان اس کتاب کو ہی پورے کا پورا اپنا لے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ اس کے بعض حصے تو ایسے ہیں جو اُن کے اخلاقی اصول سے مطابقت رکھتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں جو اُس وقت تو، جب قرآن نازل ہوا تھا، مطابقت رکھتے تھے مگر اب یہ مطابقت کسی حد تک ختم ہو چکی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر انہوں نے قرآن مجید کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک اخلاقی قانون سے مطابقت رکھنے والے تصورات اور مقاصد، تو وہ ناقابلِ تغیر ہیں۔ دوسرے قرآن مجید کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی ضابطے، تو ان میں حالات کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ ان ضابطوں کے متعلق اُن کا نظریہ ہے کہ ان کی رُوح پر ہمیں غور کر کے انہیں اخلاقی قانون کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ اگر ہم ان ضابطوں کی رُوح کو سمجھ لیں تو ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ ضابطے رُوح کے اعتبار سے اخلاقی قانون سے ہم آہنگ ہی ہیں خواہ الفاظ میں عدمِ مطابقت نظر آتی ہو۔ اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ تعددِ ازواج اور غلامی کا مسئلہ لیتے ہیں۔ اُن کا ارشاد یہ ہے کہ قرآن مجید نے یک زوجگی کو اخلاقی قانون کے طور پر تسلیم کیا ہے لیکن وحی اور ہنگامی ضرورت کے تحت تعددِ ازواج کی اجازت بھی دی ہے (ص ۲۹)۔ عورتوں کی تعداد اُس وقت کے عرب معاشرے میں چونکہ مردوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس لیے قرآن مجید نے اس بات کی لوگوں کو اجازت دی کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں نکاح میں لے آئیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی عائد کر دی کہ وہ ان کے درمیان (باقی ص ۶۴ پر)

(بقیہ اشارات)

انصاف کریں (النساء - ۳) - پھر یہ بھی کہا کہ تم کبھی انصاف نہیں کر سکتے (النساء، ۱۲۸) - ڈاکٹر صاحب ان آیات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا اصل مقصد تو یک زوجگی کے "اخلاقی قانون" کو رواج دینا ہی تھا لیکن اُس نے ہنگامی حالات کے پیش نظر تعدد ازواج کو کچھ دیر گوارا کیا۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ استدلال قرآن مجید میں تحریف کا حکم رکھتا ہے۔ کلامِ الٰہی میں جہاں فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً کہا ہے وہاں عدل سے مراد امورِ اختیاری میں عدل ہے۔ اور اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۲۹ میں جس عدل کا ذکر ہو رہا ہے اور جس کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ "تم سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کر سکو خواہ تم اس کی کیسی ہی خواہش رکھتے ہو" تو یہاں عدل سے مراد مساوات امور غیر اختیاری میں ہے، مثلاً محبت و رغبت۔ یہ بات تو انسان کے بس سے ہی باہر ہے۔ ایسی مساوات تو والدین تک اپنی ساری اولاد کے درمیان بھی قائم نہیں رکھ سکتے۔ لفظ عدل دونوں جگہ مشترک ہے لیکن مفہوم الگ الگ ہے اور اس اسلوبِ بیان کی مثالیں قرآن مجید میں کثرت سے ملتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان آیات سے جو یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن مجید نے عدل کو تعدد ازواج کی بنیاد بنا کر وقتی طور پر اجازت دی اور پھر اسے ناممکن قرار دے کر یک زوجگی کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا ہے، یہ بالکل غلط ہے۔ اگر باری تعالیٰ کا منشا یہی تھا تو اسے براہِ راست منع کرنے میں کونسی چیز مانع تھی۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے معلوم نہیں کن وجوہ کی بنا پر ۱۲۹ آیت کے ایک ٹکڑے سے تو یک زوجگی کے حق میں استدلال کیا ہے لیکن اس کے ساتھ کا ٹکڑا جو اُن کے اس استدلال کو غلط ثابت کرتا ہے، اُسے نظر انداز کر دیا ہے۔ قرآن مجید کے یہ الفاظ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ قرآن مجید تعدد ازواج کے لیے کس نوعیت کے عدل کا مطالبہ کر رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب خواہ مخواہ بڑے تکلف کے ساتھ قرآن مجید سے یک زوجگی کا ثبوت اور تعدد ازواج کی تردید ثابت کرنے کی سعی فرما رہے ہیں، ورنہ اُن کے نزدیک اصلی صورت وہی ہے جس کا ہم نے گذشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے کہ وہ قرآن مجید کے معاشرتی، سیاسی اور معاشی ضابطوں کو ابدی اصول نہیں سمجھتے بلکہ ان میں حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کے قائل ہیں۔ انہوں نے غلامی اور یک زوجگی کے مسئلہ پر "قرآن کی روح" کے مطابق غور و فکر کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے وہ قابلِ غور ہے:

> "قرآنی قانون انسانی آزادی کی ترقی پسندانہ بنیادی اقدار کے رُخ کی نشاندہی کرتا اور اس ضمن میں نئی قانون سازی کی ذمہ داری ظاہر کرتا ہے۔ تاہم قرآن کے اصل ضابطے میں اُس عہد کے معاشرے کو بطور دائرۂ کار قبول کرنا پڑا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے اصل ضابطے قرآن ہی کی نظر میں لفظی اعتبار سے ابدی نہیں ہو سکتے۔" (ص ۳۹)

یہ ہیں اسلام کے متعلق اُس شخص کے تصورات، اور یہ ہیں اُس کی تحقیق کے چند "نادر نمونے" جو اس ملک میں اسلامی تحقیقات کر رہا ہے اور جسے غریب مسلم قوم کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے ایک بھاری مشاہرہ ادا کیا جا رہا ہے۔